بانو قدسیہ کا ناول ''شہرِ بے مثال'' ۔ایک مطالعہ

شمروز اللہ دتہ

Shamroz Allah Ditta

M.Phil Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

منزہ منور سلہری

Munazza Munawar Sulehri

Assistant Professor, Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Bano was a novelist, fictionist, play writer and spiritualist. She wrote Urdu literature distinctively in producing novels, drama, plays and short stories. She authored several memorable novels which remained in the living minds, and it includes, Raja Gidh(The king vulture), which is well revered among readers of Urdu literature. This article is written on her novel "Shehr-e- Bemasaal "which is book mark novel of the author and it was actually described the retrogression of civilization, ruination of values ruination of values and customs, depravation, dorsoventrally contradiction, physical intricacy and mental complexity of this city in said novel. This research article not only showers lights on all aforementioned components but effort has also been made for critical review of said aspects.

بانو قدسیہ کا ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ہونے کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف بھی رجحان تھا، انھوں نے بہت سے ناول افسانے، اور ڈرامے تحریر کیے جو قارئین کے ذہنوں میں نقش ہیں۔ بانو قدسیہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو مشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ نے ان کا نام ''قدسیہ بانو'' رکھا لیکن بعد ازاں وہ ادب میں ''بانو قدسیہ'' کے نام سے معروف ہوئیں اور آج تک وہ اسی نام سے جانی جاتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سکول دھرم شالہ سے حاصل کی پھر ان کا خاندان ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تو انھوں نے ایف اے اسلامیہ کالج کوپر روڈ سے کیا اور بی۔اے کنیرڈ

کالج سے کیا۔ ایم اے اردو کی ڈگری انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج کے ماحول نے بانو قدسیہ کی شخصیت میں ایک نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اشفاق احمد رسالہ راوی میں کہتے ہیں:

''بانو قدسیہ اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی درسگاہ نہیں سمجھا اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درسگاہ نہیں درگاہ مانتے ہیں۔''(۱)

دورانِ تعلیم بانو قدسیہ کی ملاقات اشفاق احمد سے ہوئی اور دونوں کو آپس میں محبت ہوگئی۔ اگرچہ دونوں خاندانوں میں بہت فرق تھا لیکن بغاوت مول لے کر دونوں نے آخر کار شادی کر لی، بانو آپا کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں انھوں نے ادب کی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ انھوں نے مقبول ناول اور افسانوں کے ساتھ ساتھ شاہکار ڈرامے بھی لکھے۔ ان کی شخصیت میں بہت سارے رجحانات ایک ساتھ پائے جاتے تھے۔ وہ گھر داری میں بھی خاصی دلچسپی رکھتی تھیں اور مہمان نواز بھی بہت تھیں۔ بانو قدسیہ نے باقاعدہ طور پر ۱۹۵۰ء میں لکھنا شروع کیا۔ وہ زندگی کی گہری بصیرت رکھنے والی ناول نگار تھیں۔ بانو قدسیہ کے افسانوں کے موضوعات ان کے غیر معمولی مشاہدے وسیع شعور اور اندازِ فکر کا ثبوت ہیں۔ وہ کہانی کا تانا بانا بنتے وقت فکر اور دانش کی گتھیاں سلجھاتی ہیں اور اس سب میں وہ اپنے قاری کو شامل رکھنا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر نورین رزاق اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

''بانو قدسیہ کے افسانوں اور ناولوں میں بیک وقت کئی رجحان نظر آتے ہیں انسان کے جذباتی نفسیاتی روحانی اور باطنی مسائل ان کا خاص موضوع ہیں۔''(۲)

اپنی تصانیف میں انھوں نے عورت کو خاص طور پر کھل کر بیان کیا ہے کہ عورت کیسی فطرت کی مالک ہے۔ چاہے تو بڑی سے بڑی غلطی پل بھر میں بھول کر معاف کر دے اور چاہے تو چھوٹی سے چھوٹی بات پر منہ بنا کر بیٹھ جائے چاہے تو مرضی کے کپڑے نہ ملنے پر عید نہ منائے اور چاہے تو ناپسند شخص کے ساتھ ساری زندگی چُپ چاپ گزار دے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں عورت کی جذباتیت سے لے کر حساسیت تک کے تمام پہلوؤں کو خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔

انھوں نے عورت کی فطرت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور دکھایا ہے کہ کسی طرح عورت روزمرہ کی زندگی میں معاملات سے اُکتا جاتی ہے۔ ''میرا خیال ہے اماں حوا کو بھی جنت کی طرز زندگی بُری لگی وہی باغ، وہی موسم، وہی پھل توبہ، توبہ میں تو مر گئی ہوتی جنت میں۔''(۳)

ان کے ناولوں میں ان کی شخصیت کی ایک گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ انھوں نے ادب میں بہت سارا عمدہ کام کیا جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا انھوں نے جہاں عمدہ و مشہور ناول راجہ گدھ، اور حاصل گھاٹ جیسے شاہکار لکھے وہاں ان کا ناول ''شہرِ بے مثال'' بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ''شہرِ بے مثال'' بانو قدسیہ کا ایک شاہکار ہے۔ بانو قدسیہ نے اس کا انتساب اشفاق احمد کے نام کیا ہے۔ انھوں نے شہرِ بے مثال کو تقریباً دو سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں نسوانی کردار، رشیدہ، خالہ فیروزہ اور رشیدہ کی والدہ کا ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے اس ناول میں بہت خوبصورتی سے معاشرے کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح رشیدہ بہاولپور کے ایک چھوٹے سے علاقے سے اٹھ کر لاہور جیسے بڑے شہر میں اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے آتی ہے۔ مگر وہ جیسے ہی لاہور جیسے بڑے شہر میں آتی ہے یہاں کا ماحول دیکھ کر گھبرا جاتی ہے کہ وہ کس طرح اس بڑے شہر میں گزارہ کرے گی۔ کس طرح وہ خود کو اس ماحول کے مطابق ڈھال سکے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ماحول کی

عادی ہو جاتی ہے۔ بانو قدسیہ چونکہ خود ہجرت کر کے لاہور جیسے بڑے شہر میں آئی تھیں اس لیے وہ اس شہر کی سائیکی کو بہت اچھے سے جانتی تھیں جو انھوں نے اپنے اس ناول میں بیان کی ہے وہ لکھتی ہیں:

''عام آبادی کی ہوتی ہے ایک شہ رگ جس سے اس کا لہو جاری رہتا ہے اس بے مثال شہر کی شہ رگیں بھی دو تھیں۔ ایک جو لہو کی گردش کے لیے مخصوص تھی دوسری وہ جس میں احساس برتری کا ناگ پھن اٹھائے پھرتا تھا یہ اس شہر کے لوگوں کو زیادہ عزیز تھی شاید لہو کی گردش بند ہونے پر وہ زندہ رہ سکتے تھے لیکن احساس برتری کے بغیر انھیں پل بھر بھی سانس لینا دشوار ہوتا۔''(۴)

یہ ایک بہت عجیب سی بات ہے کہ جو اس شہر میں آتا ہے اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رشیدہ گاؤں سے اٹھ کر شہر میں آئی تھی اور یہاں اس کو اپنی خالہ کے گھر رہنا تھا جس کا نام فیروزہ تھا۔ خالہ فیروزہ کو بھی احساس برتری نے گھیر رکھا تھا۔ وہ رشیدہ کو بہت کمتر جانتی تھیں ان کو رشیدہ اپنے گھر میں کسی بوجھ سے کم نہیں لگتی تھی۔ وہ پہلے دن سے ہی نہیں چاہتی تھیں کہ رشیدہ اُن کے گھر میں رہے لیکن کچھ پرانے رشتوں اور مروت کے مارے انھیں رشیدہ کو اپنے گھر رکھنا پڑا۔ انھوں نے رشیدہ کو اپنے گھر کے سٹور روم میں رکھا تھا لیکن رشیدہ اس سٹور روم میں بھی آرام سے زندگی گزارنے لگی تھی۔ پھر وقتاً فوقتاً رشیدہ اپنی اماں کو خط لکھے گی اور پھر خط میں وہ اس بات کا جھوٹا اعتراف کرتی کہ اماں فیروزہ خالہ ان کا بہت خیال رکھ رہی ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ ماں سے ضد لگا کر آئی ہے اور اگر اب خط میں ایسا ویسا کچھ لکھے گی تو ماں پریشان ہوگی۔ رشیدہ کو یاد تھا کہ وہ کتنی مشکل سے اجازت لے کر آئی تھی کس طرح اس نے ماں سے ضد کی تھی جب ماں سے کہا تھا:

''کیا مجھے وہ کائی سمجھتی ہیں جو متعفن تالاب کی سطح پر آپ ہی آپ سڑ جاتی ہے میں یوں کاہل مجبور ہو کر نہیں بیٹھ سکتی میں معمولی بھنڑی نہیں لیکن جاندار ہوں پر رکھتی ہوں مجھ سے یہ کولہو کے بیل کی سی زندگی بسر نہ ہوگی۔''(۵)

اس لیے رشیدہ اب خطوں میں ماں سے کوئی شکایت نہ کرتی تھی۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول میں بہت تفصیل سے احساس برتری کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح یہاں کے لوگوں میں احساس برتری کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مانو کے احساس برتری تو جیسے ان کو گھٹی میں ملا ہو۔ بانو قدسیہ بہت تفصیل سے احساس برتری کو بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ کس طرح رشیدہ بہاولپور سے آئی ہوئی لڑکی پہلے دن کلاس روم میں جاتی ہے کس طرح وہ گھبرائی ہوئی ہوتی ہے کس طرح ڈاکٹر اعجاز اس کا انٹرویو کرتا ہے اور کس طرح ساری کلاس رشیدہ کے تعارف پر کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ کس طرح سارے طالب علم رشیدہ کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ ایک کمتر لڑکی ہے۔

اس سب کو بانو قدسیہ نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بعد ازاں رشیدہ کی کلاس کی لڑکیوں سے دوستی ہو جاتی ہے لڑکیاں رشیدہ کو جاننے لگتی ہیں۔ آہستہ آہستہ رشیدہ اس نئے ماحول کی عادی ہو جاتی ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول میں معاشرے میں لڑکیوں کی کچھ مجبوریوں کو بھی ظاہر کیا ہے انھوں نے بیان کیا ہے کہ کس طرح ماحول چاہے کتنا ہی کھلا کیوں نہ ہو لڑکیوں کو ہمیشہ ماں باپ کی اجازت درکار رہوتی ہے۔ اس کے برعکس لڑکے خود مختار ہوتے ہیں وہ تقریباً ہر معاملے میں اپنی مرضی کرتے نظر آتے ہیں۔ ظفر جو کہ رشیدہ کا کلاس فیلو ہے وہ لڑکیوں کو پکنک پر جانے کا کہہ رہا ہوتا ہے جس پر لڑکیاں گھر سے اجازت

کا کہہ دیتی ہیں اس پر ظفر لڑکیوں کے خلاف ساری بھڑاس اپنے دوستوں کے ساتھ نکال رہا ہوتا ہے۔اس دوران بہاولپور سے آئی رشیدہ میر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ غازی، ظفر، افتخار، حسیب اس کے تعارف دینے کے طریقے کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ادھر رشیدہ پرائے گھر میں عجیب سہمی سہمی رہتی ہے۔اسے ہر بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں میرے فعل سے خالہ فیروزہ کا دل نہ دکھ جائے۔ یہاں تک کہ وہ پکنک کے دن بھی پریشان نظر آتی ہے کہ وہ اتنی ہمت نہیں کر پاتی کہ خالہ فیروزہ سے جانے کی اجازت کس طرح مانگے۔آخر وہ پارٹی پر نہ جانے کا سوچتی ہے جس پر خالہ فیروزہ کی بیٹی تنویر اس کو زبردستی پارٹی پر جانے کا کہتی ہے اور ساتھ میں اس کو ٹسر کی چادر دیتی ہے۔رشیدہ پکنک پر چلی جاتی ہے۔آخر میں لوگ میانہ محل پہنچ جاتے ہیں اور شاہ جہاں اور عالمگیر کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔تمام لڑکیاں بھرپور تیاری کے ساتھ آتی ہیں۔سب لڑکیوں میں سے ڈمپل خوبصورت نظر آ رہی ہوتی ہے۔سب ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں اور پھر ٹولیوں کی شکل میں لڑکے لڑکیاں الگ الگ ہو کر گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ شاہ جہاں کے دور کی ہر چیز کمال تھی، چیزیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انسان ان کے دور میں چلا گیا ہے۔ چیزوں کی خوبصورتی کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ وہ لوگ کس قدر شعور رکھتے تھے۔ان کی ہر عمارت خوبصورتی کا سرچشمہ تھی۔شالیمار باغ کا نقشہ بانو قدسیہ نے احسن طریقے سے بیان کیا ہے:

> ’’یہ حمام شاہ جہاں کے ذوق کی کھلی دلیل ہے۔سنگ مرمر کا تین درجہ حمام کہ جہاں پانی گرنے کی آواز بطور بارش مسموع ہوتی ہے طاقچہ پائے صحرابی خرخریاں اس تواتر اور خوبی سے ہے کہ جب یہاں چراغاں کر کے مغل شہزادیاں غسل فرماتی ہوں گی تو شعاع چراغاں بطور برق اور پانی بارش سے مماثل نظر آتا ہوگا۔‘‘(۶)

ظفر جو کہ رشیدہ کا کلاس فیلو ہے وہ جب رشیدہ کو دیکھتا ہے اس کو اپنے اندر ایک عجیب سا احساس پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔اسے اپنے اندر ایک طرح کا شور اور منہ زور اٹھتا ہوا جذبہ محسوس ہوتا ہے۔ پکنک کے دوران ظفر رشیدہ میر کی تصویر بنا لیتا ہے۔ظفر دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا ہے کہ اس نے رشیدہ کی تصویر بنائی ہے۔ وہ خوشی خوشی گھر کو جاتا ہے کیونکہ اس کے کیمرے میں ٹسر کی چادر والی لڑکی ہوتی ہے اب وہ جلد از جلد اس تصویر کو دیکھنا چاہتا ہے۔ظفر کے گھر کا ماحول خاصا گہما گہمی والا تھا۔وہاں پر ظفر کی خالہ حمیرا، سب لوگ جمع تھے۔خاندان کی سب لڑکیاں ظفر سے بہت متاثر تھیں وہ ظفر کو دیکھ کر آپس میں باتیں کرتیں اور شاید ان ہی میں سے ظفر کی دلہن بھی تھی۔ گھر والوں سے ظفر کی کوئی اتنی خاص قسم کی انڈرسٹینڈنگ نہ تھی،اس وجہ سے گھر آتے بڑے بھائی بعض دفعہ پوچھ لیتے کہ کہاں مصروف ہوئے ہو تو ظفر کالج میں مصروفیت کا بہانا بنا کر بات کو ٹال دیتا ہے۔ ظفر کا کمرہ اوپر والی منزل پر واقع ہوتا ہے۔ظفر کے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ظفر کا باپ عمر میں ۵۰ کے لگ بھگ ہے مگر وہ جسمانی طور پر فٹ دکھائی دیتا ہے۔ وہ دیکھنے میں اپنے بیٹوں کا بھائی ہی لگتا ہے۔اپنی وضع قطع اور خوبصورتی کو لے کر وہ بہت زیادہ جاذب نظر پایا جاتا ہے۔ایک مختلف انداز سے بات کرنے کا ڈھنگ اس میں پایا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد اس سے اپنے دکھ سکھ خوشیاں سب بیان کریں اور وہ ان کی باتیں سن کر ان کے مسائل کو حل بھی کرے لیکن اولاد کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی کوئی بھی بات باپ سے کرنے پر راضی نہیں بچوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو باپ کے ساتھ کھل کے بات کرتا ہو۔ یہاں تک کہ بڑی بیٹی کو بھی باپ کے گھر آئے ۵ مہینے گزرنے کو ہیں اور اس نے باپ کو یہ تک نہیں بتایا کہ وہ کیوں آ کر بیٹھی ہوئی ہے۔ میکے آنا تو دور کی بات یہ تک نہیں بتایا کہ ۲ طلاقیں ہو چکی ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ظفر کے ماں باپ کی آپس میں نہیں بنتی تھی

۔اب تو بہت عرصے سے وہ دونوں الگ ہو چکے تھے اور بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ باپ اوپر والے کمرے جب کہ ماں نیچے رہتی تھی۔ ماں کے پاس خاندان والوں کا رش لگا رہتا تھا۔ظفر کا کمرہ اوپر والے حصے میں اس کے باپ کے ساتھ تھا باپ اکثر وہاں سے ظفر کو خود بلا لیتے تھے اور سمجھا تا کہ اپنی ساری توجہ پڑھائی کی جانب کرو۔ادھر ظفر پوری طرح رشیدہ کے عشق میں پاگل ہو چکا تھا۔ وہ رشیدہ کو خط لکھتا تھا باقاعدگی کے ساتھ مگر رشیدہ نے آج تک نہ تو اس کے خط کھول کر پڑھے تھے اور نہ ہی ان خطوط کا کوئی جواب دیا تھا بلکہ وہ اس سب کو ایک ڈبے میں رکھتی گئی۔ آخر ایک دن آیا کہ رشیدہ کے وہ سارے خط خالہ فیروزہ کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور خالہ فیروزہ تو پہلے ہی کسی بہانے کی تلاش میں تھیں انھوں نے فوراً رشیدہ کو گھر سے نکل جانے کا کہا۔ سامان سمیت رشیدہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کدھر جائے اس کا ٹھکانہ بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ ڈمپل سے گرلز ہاسٹل کا پوچھتی ہے تو ڈمپل اس کو اپنے گھر لے جاتی ہے ڈمپل کا بڑا سا ایک گھر ہے تو وہ رشیدہ کو اس میں رکھ لیتی ہے۔

بانو قدسیہ نے بہت خوبصورت طریقے سے خالہ فیروزہ کے ذریعے لاہور کی ایک ماڈرن عورت کا نقشہ اور اس کی سوچ کو بیان کیا ہے۔اُدھر رشیدہ کو یہ غصہ کہ ظفر کی وجہ سے اس کو گھر سے نکال دیا گیا ہے جب کہ اس کا اس بات میں قصور بھی نہیں ہے کہ وہ تمام خط لے کر ظفر کے گھر پہنچ جاتی ہے اور ظفر کے والد کو دکھا دیتی ہے وہ رشیدہ کو دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ کس طرح بے باکی سے وہ ان کو سب بتاتی ہے۔ظفر کا باپ رشیدہ کے جانے کے بعد ظفر کو کمرے میں بلا کر خطوں کی بات کرتا ہے اور اسے کہتا ہے:

''جانتے ہو تمھارے خطوں کی اس کو کیا سزا بھگتنا پڑی ہے۔اس کا قصور یہ ہے کہ بغیر قصور کے اُسے خط آئے ہیں۔اس بے قصوری کی پاداش میں اُسے گھر سے نکال دیا گیا ہے۔''(۷)

ظفر کا باپ ظفر کو سمجھاتا ہے کہ تم پڑھائی پر توجہ دو، امتحانوں کے بعد تمھارا نکاح رشو سے کر دیں گے۔اس امتحانوں والے عرصے کے دوران ظفر کا باپ رشیدہ سے ملاقاتیں شروع کر دیتا ہے اور آخر کار رشیدہ میر سے نکاح کر لیتا ہے۔رشیدہ شروع والے دنوں میں کچھ عرصہ تو ٹھیک رہتی ہے مگر پھر ہر چیز رشیدہ کے دل سے اُترنے لگتی ہے وہ نیم پاگل سی ہو جاتی ہے اور آخر کار وقت گزرتا ہے اور اگلی صبح اخبار میں خبر چھپتی ہے:

''گلبرگ کی پُر رونق آبادی میں کل رات لاہور کے لکھ پتی تاجر ملک بختیار علی اپنے کرائے کی کوٹھی میں قتل کر دیئے گئے اُن کے پہلو میں ان کی نوجوان بیوی نیم برہنہ حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔۔۔ان کی بیوی مسز رشیدہ ملک کے کہنے پر ملازم نے پولیس چوکی میں اس وقوع کی اطلاع کی۔''(۸)

بانو قدسیہ نے ناول میں خوبصورتی کے ساتھ تمام تر مسائل کو بیان کیا ہے کہ کس طرح ایک لڑکی پڑھنے آئی ہے اور اس شہر کے لوگ اس کو کس طرح کا بنا دیتے ہیں۔ یہ تمام تر باریکیاں انھوں نے ناول میں تحریر کی ہیں۔انھوں نے ناول میں اپنوں کی خودغرضیوں اور بے رحمی کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ کس طرح ظفر کا باپ بیٹے سے دھوکہ کرتا ہے اور کس طرح رشیدہ کی خالہ اس کو گھر سے نکال دیتی ہے۔ وہ اس سب کے ذریعے معاشرے کے تاریک پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے بات کرتی ہے کہ کس طرح ہم اپنی چھوٹی چھوٹی غلط فہمیوں کی وجہ سے اگلے کو اس دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ بعض اوقات انسان کو جینے کا راستہ ہی سمجھ میں نہیں آتا:

''بانو قدسیہ کے افسانوں کی نفسیاتی و نظریاتی اساس اسے ان کے خارجی اور داخلی رویوں اور

باطنی کرب کے ساتھ وابستہ ہے روحانی اور اخلاقی انحطاط کے شکار کردار خود پسندی و تشلک، تنہائی و خوف و تجسس، تذبذب اور اذیت کا شکار ہیں اور جزا اور سزا کے فلسفے پر بحث کرتے ہیں۔''(۹)

انھوں نے ناول میں کرداروں کے ذریعے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ معاشرے کی تصویر کشی مختلف پہلوؤں میں کرتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر نورین رزاق لکھتی ہیں:

''وہ ایک طرف انسانی فطرت کی فریب کاریوں، منافقت، ہوس اور ریا کاریوں کا پردہ چاک کرتی ہیں تو دوسری طرف ان کے ہاں نفس کی کارفرمائیوں کے پیچھے پوشیدہ محرکات داخل و خارجی شخصیت کا تصادم اور روحانی قرب زیر بحث آتا ہے۔''(۱۰)

انھوں نے اپنے اکثر ناولوں میں عورت کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ عورت کی تمام تر کیفیات کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتی ہیں۔ بانو عورت اور مرد کی فطرت کا امتیاز بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مرد کی ذات ایک سمندر سے مشابہ ہے اس میں ہمیشہ پرانے پانی بھی رہتے بہتے ہیں اور نئے دریا بھی آ کر گلے ملتے ہیں۔ سمندر سے پرانی وفا اور نیا پیار الگ نہیں کیا جا سکتا وہ دونوں کے لیے مرے گا لیکن تسکین عورت اس جھیل کی مانند ہے جس کا سرچشمہ اس کے اندر ہی سے نکلتا ہے۔''(۱۱)

ایک اور جگہ وہ لکھتی ہیں:

''عورت کی کھوپڑی حجلۂ عروسی ہے۔ اس میں ڈھولک بجتی رہتی ہے۔ سہرے بکھرے ہوئے ہیں پھر کم بخت چاہتی ہے کہ اسے مردوں کے برابر حقوق دیے جائیں۔ عورت پروفیسر ہو چاہے وکیل، چاہے ملک کی ادیبہ ہو، لیڈر ہو، اس کے ذہن میں ہمیشہ عاشقی گھسی رہتی ہے۔''(۱۲)

مختصر یہ کہ بانو قدسیہ کے ناولوں میں ہمیں عورت اور مرد کی نفسیات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بانو قدسیہ نے عورت کے حقوق، اس کی ازدواجی زندگی کو اکثر ناولوں میں موضوع بحث بنایا ہے۔ غرض یہ کہ بانو قدسیہ کے ناول ''شہرِ بے مثال'' کا ہر پہلو اس قدر دلچسپ ہے کہ قاری کو بہت متاثر کرتا ہے اور قاری کو سیکھنے کے لیے بہت کچھ ملتا ہے۔ بانو قدسیہ کی یہ خوبی ہے کہ ان کا بات کو مثال دے کر بیان کرنے کا طریقہ دیگر سے مختلف بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اشفاق احمد، رسالہ راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، اپریل ۱۹۶۹ء

۲۔ نورین رزاق، ڈاکٹر، پاکستان خواتین افسانہ نگار، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، جولائی ۲۰۱۶ء، ص:۳۰۱

۳۔ بانو قدسیہ، نقش اگر ساحل، مشمولہ: امر بیل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۷

۴۔ بانو قدسیہ، شہرِ بے مثال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص:۱۹

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، ص:۳۴

۷۔ ایضاً، ص:۱۸۰

۸۔ ایضاً، ص:۲۷۲

۹۔ نورین رزاق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین افسانہ نگار، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، جولائی ۲۰۱۶ء، ص:۳۰۱

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ بانو قدسیہ، توجہ کی واپسی، مشمولہ: کچھ اور نہیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص:۱۳

۱۲۔ بانو قدسیہ، نقش اگر بادل، مشمولہ: امر بیل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۷

☆......☆......☆